انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۵۔ شمارہ ۴۳ | اڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر نومبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

جواہر لال نہرو کی یاد میں

(۲)

حال میں والٹر کراکر کی ایک کتاب جواہر لال نہرو کے متعلق شائع ہوئی ہے۔ کراکر پہلے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک آسٹریلیا کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے ہندوستان میں رہے۔ انھیں ہندوستان کو دیکھنے اور نہرو سے قریب ہونے کے خاصے مواقع ملے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آئے اور ۱۹۶۲ء تک رہے۔ اس طرح ساڑھے چھ سال کے طویل عرصے میں نہرو کی شخصیت سے انھیں گہری دلچسپی ہوگئی۔ اس دلچسپی کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ ٹوائن بی نے کتاب کے مقدمے میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ نہرو کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس کتاب کی مستقل جگہ ہے اور جو بھی نہرو کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے اور اس کے نتائج پر غور کرنے پر مجبور ہوگا۔ ہمارے لیے اس کتاب کا مطالعہ اس لیے اور بھی دلچسپ ہے کہ اس میں نہرو کے ساتھ ہمدردی اور نہرو کی شخصیت کے جادو سے متاثر ہونے کے باوجود نہرو کے بے لاگ مطالعہ کی کوشش ہے۔ اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ آج کے اداریے میں اس کا حوالہ دیں۔ کتاب کی ترتیب دلچسپ ہے۔ پہلے نہرو کا نظارہ ہے، پھر ہندوستان اور ہندوستانیوں کا نہرو کے عہد میں پس منظر ہے۔ پھر نہرو کی اپنی زندگی کا پس منظر ہے، پھر ہندوستان کے وزیر اعظم پر بحث ہے، پھر انسان کی حیثیت سے نہرو کا جائزہ ہے۔ آخر میں تعمیر اور تخریب کے عنوان سے ایک باب ہے اور آخری سفر کے عنوان سے خاتمہ ہے۔

پہلے باب میں نہرو کی جرأت، ان کی ان تھک محنت، ان کی تنہائی، ان کی عوام سے بے پناہ محبت، اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہرو کی دوسروں کی دلبری اور دلداری کے قصے ہیں۔ ان سے نہرو کی خوئے دلنوازی کی بڑی روشن تصویر ابھرتی ہے۔ دوسرا باب بہت اہم ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر زور دیا ہے کہ نہرو مشرقی سے زیادہ مغربی تھے۔ کراکر نے انھیں تین ہزار سال سے کے برہمنی سلسلے کے اثرات اور ڈیڑھ سو سال کی برطانوی دور کی

عقلیت اور حریت پسندی کی روشنی میں دیکھا ہے اور ہماری رائے میں یہ زاویۂ نظر زیادہ صحیح ہے۔ کراکر نے ہندوازم کے متعلق بہت سی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ وہ مذہب کے اثرات کو قومی کردار کے تجزیے میں اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوازم کو سمجھنے کے لیے ہومر کے دور کے یونان کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کراکر کے نزدیک یہاں خیر اور شر کے درمیان اتنی واضح لکیر نہیں ہے جتنی عیسائیت اور اسلام میں۔ اخلاقی ذمے داریوں، وقت، آزادیٔ ارادی، قوت، صداقت کے متعلق ہندوستانی نقطۂ نظر یورپی اقوام کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہندوستانی ایک مچھلی کی طرح ہیں۔ ابھی آپ نے اس مچھلی کو پکڑ لیا ہے اور ابھی یہ آپ کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہندوستانیوں میں مذہبی روح ہے جس طرح ان کے یہاں ذات پات ہے۔ دونوں سے الجھنے کے بجائے دونوں کو سمجھنا چاہیے۔ کچھ جانوروں کی پرستش مگر ان کی دیکھ بھال سے بے نیازی کے تجربے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ایک مجموعی معقولیت بھی ہے اور ایک متوازن زندگی کا تصور بھی۔

اگر مذہب کا ہندوستانی کردار پر سب سے گہرا اثر ہے تو بیرونی سامراج کی غلامی کا اثر اس کے فوراً بعد آتا ہے۔ بیرونی سامراج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستانیوں میں ایک خاص بات یہ پیدا ہوئی کہ وہ براہ راست بات نہیں کرتے، دوسروں پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں اور کچھ لوگوں میں ایک خاص چالاکی بھی۔ اس کی وجہ سے آگئی ہے وہ گفتار کے غازی زیادہ ہیں کردار کے کم۔ ایک اشتہار بازی، وعدے کا پاس نہ کرنا، ایک بھکاری کی ذہنیت خاصی عام ہیں۔ مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے مردوں کے کردار پر خاص اثر پڑا ہے۔ کراکر کے خیال میں جاہ پرستی اور رشوت ستانی بھی عام ہیں گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستانی اس معاملے میں بعض دوسری قوموں سے گئے گزرے ہیں۔ پھر وہ اپنے مطالبات یا مقاصد کی صداقت پر ضرورت سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان میں وفاداری کا جذبہ ہے، ان میں ذہنی صلاحیت ہے، ان کے ادیبوں اور مصنفوں میں ایک ذہنی بلوغت ہے، ان میں احساس ہے، ایک روحانیت کا احترام ہے اور محبت کا جذبہ ہے۔ کراکر کے اس تجزیے سے ممکن ہے سب کو اتفاق نہ ہو، بعض کو بالکل نہیں ہے، مگر یہ ایک ایسے شخص کا مطالعہ ہے جو ہندوستان میں عرصے تک رہا ہے اور جو ہندوستان سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ جواہر لال نہرو کا برطانوی حکومت کے متعلق

یہ تبصرہ کہ وہ ناقابل یقین حد تک بُرا تھا، مبالغے پر مبنی ہے مگر یہ تبصرہ سمجھ میں آتا ہے کیونکہ انگریزوں کی حکومت ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے نہیں انگریزوں کے فائدے کے لیے تھی۔ ہندوستانیوں کا خسارہ یقینی تھا اور اس کا جو نقصان ہوا اور اس کی ترقی میں جو رکاوٹ ہوئی اسے کوئی قوم پرست اور محب وطن ہندوستانی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ نہرو کو یقین تھا کہ انگریز ہندوستان سے خود نہیں جائیں گے اس لیے انھیں نکالنے کے لیے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

نہرو اٹھارہ برس تک برسر اقتدار رہے۔ یہ ایسا ریکارڈ ہے جو پارلیمانی حکومتوں میں عام نہیں ہے۔ نہرو کو ایک پرسکون زمانہ نہیں ملا۔ سب سے پہلے انھیں تقسیم اور فسادات کی قیامتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں ہندوستان کو جدیدیت کے راستے پر لگانا تھا مگر ان کے راستے میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ نہرو کے لیے قوم پرستی، سوشلزم لانے کے لیے ضروری تھی۔ آخر میں وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے پر وقت کم صرف کر سکے اور روزمرہ کے انتظامی معاملات کو چلانے میں زیادہ لگے رہے۔ انھوں نے ہندوستان کو ایک سیکولر دستور دیا، پارلیمانی نظام کو مضبوط کیا، سیکولرزم کو دستور میں اور زندگی میں جگہ دی، سماج میں ہندو کوڈ بل کے قسم کے قوانین کے ذریعے اصلاح کی اور پنج سالہ منصوبے بنائے اور چلائے۔

یہ ضرور ہے کہ ان منصوبوں کی وجہ سے ملک میں انتشار بھی پیدا ہوا۔ بیرونی امداد کے سہارے نہرو جلد سے جلد صنعتی دور میں قدم رکھنا چاہتے تھے۔ کراکر کا خیال ہے کہ اقتصادی پیداوار کی صلاحیت میں جو فرق ترقی یافتہ اور پس ماندہ ملکوں میں ہے وہ تاریخی ارتقا کا فرق ہے اور صدیوں کا فرق سالوں میں دور نہیں ہو سکتا۔ مگر نہرو کے سامنے ہندوستان کی غربت بھی تھی اور آبادی کی کثرت بھی۔ اس لیے نہرو زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے اور آمریت کے طریقے سے جو کچھ ہو سکتا تھا اس کے لیے وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے اس لیے ناکامی قدرتی تھی۔ نہرو نے منصوبہ بندی میں ملک کی ترقی کا زیادہ خیال رکھا تھا ملک کے دفاع کا کم۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترقی ہی بہترین دفاع ہے۔ کراکر کا خیال ہے کہ منصوبہ بندی کا تصور صحیح تھا مگر بڑی بڑی اسکیموں کی جادو کی چھڑی سے صدیوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش ناکام ہونی ہی تھی۔ نہرو نے پارلیمانی جمہوریت کو خاص مستحکم بنایا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مستقبل محفوظ ہے۔ ہاں نہرو کے اثر سے وہ آسانی سے شکست نہ کھائے گی۔ پھر نہرو کا استعفیٰ قبول نہیں کرنے چاہئیں تھے، اتنے عرصے تک وزیر اعظم رہنا چاہیے تھا کسی نے کہا تھا کہ نہرو ایک برگد کا پیڑ تھے اس کے سائے میں کوئی چیز اُگ نہ سکتی تھی۔

امور خارجہ کے بارے میں کراکر کی رائے خاص اہمیت رکھتی ہے ہم اس کا اگلی اشاعت میں جائزہ لیں گے۔

ادارہ فروغ اردو رامپور شاد عارفی کی کلیات شائع کرے گا

رامپور۔ ادارہ فروغ اردو کی ایک نشست کی گئی۔ صدارت کے فرائض جناب ڈی اقبال نے انجام دیے انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں ذاتی تجربات کی روشنی میں کئی مشورے دیے اور بتایا کہ شروع میں ہم ان نشستوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے بلکہ ایک تفریح اور وقت گزاری کا مشغلہ سمجھ کر اس کو اختیار کیا تھا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہم لوگوں کی ادب سے دلچسپی بڑھتی گئی ہے جو ان ادبی نشستوں کی دین ہے۔

مسرت حسین آزاد نے شاد عارفی کی شخصیت پر ایک تقریر کے ذریعہ روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ شاد صاحب کا ایک شاگرد بھوپال میں بیٹھ کر ایک ہزار صفحات پر مشتمل کتاب کی تیاری میں مصروف ہے یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔ ادارہ فروغ اردو بھی عنقریب ان کی کلیات شائع کرے گا۔

(ناظم رامپوری)

نسخ میں ٹیلی پرنٹر تیار، بہت جلد کام کرنے لگے گا

پشاور ۲۰ نومبر۔ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ اردو کا ٹیلی پرنٹر (خود کار ٹائپ رائٹر جس میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو تار، پیغامات اور خبریں وغیرہ بھیجی جا سکتی ہیں) تیار کر لیا گیا ہے۔

پاکستان کی خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان بہت جلد اس ٹیلی پرنٹر کو استعمال کرے گی اور جن اردو اخبارات کو وہ خبریں فراہم کرتی ہے ان کو اب اردو ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ ہی خبریں اردو رسم خط ہی میں فراہم کرے گی۔

اردو ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نستعلیق خط ہے جس میں جوڑ اتنے زیادہ ہیں کہ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر بنانا ناممکن سا ہے۔ لیکن نسخ جس میں عربی عموماً لکھی جاتی ہے اور جس سے اردو بھی نامانوس نہیں ہے یہ دقت نہیں پیش کرتا ہے اس میں ہی معمولی رد و بدل کر کے ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر تیار کیا گیا ہے۔

اردو کا یہ نیا ٹیلی پرنٹر اب تجرباتی یا تیاری کی منزل سے گزر کر پیداوار کی منزل میں آ گیا ہے اور کچھ مشینیں ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان کو مل بھی گئی ہیں۔

(قومی آواز لکھنؤ)

وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش نے ادبی سنگم کو ایک ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا

بھوپال ۳۰ نومبر۔ "اردو ایک زندہ زبان ہے اور اسے کوئی ہندوستان سے مٹا نہیں سکتا۔ جس طرح دنیا کی دوسری زبانوں میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں یقین ہے کہ اردو بھی نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔" ریاستی وزیر اعلیٰ پنڈت دوارکا پرشاد مصرا نے کل یہ الفاظ ایوان صدر میں "بھوپال میں غزل" نامی کتاب کی افتتاحی تقریب میں کہے۔ "بھوپال میں غزل" بھوپال کے ۲۵ شعراء کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کو جناب گلشن ساگری نے مرتب کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ بھوپال میں اردو کی کئی انجمنیں ہیں ان سب انجمنوں کو چاہیے ایک متحدہ تنظیم بنا کر اردو کی ترویج و ترقی کے لیے تجاویز پیش کرنا چاہئیں تاکہ ان کی روشنی میں کچھ اقدامات کیے جا سکیں فی الحال میں ادبی سنگم کو ایک ہزار روپے دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ "بھوپال میں غزل" کا یہ افتتاحی جلسہ ادبی سنگم کے زیر اہتمام اور حکیم قمر الحسن صاحب کی صدارت میں ہوا۔

(افکار بھوپال)

عظیم الشان صدیقی

فسانۂ لطافت بار ۔ یا سیر کہسار

فسانۂ لطافت بار کے بارے میں جناب نادم سیتاپوری کا ایک مضمون "ہماری زبان" کے ۸ر دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں چھپا تھا جس میں موصوف نے چند سوالات اٹھائے تھے۔

(۱) کیا فسانۂ لطافت بار سیر کہسار کا دوسرا نام تھا (۲) اور کیا یہ سیر کہسار کا پہلا حصہ تھا (۳) یا فسانۂ لطافت بار کے نام سے سرشار کی کوئی اور تصنیف بھی ہے۔ آخر میں انھوں نے ارباب فکر کو یہ گتھی سلجھانے کی دعوت دی تھی۔ مجھے اپنے موضوع "اردو ناول" کے سلسلہ میں ہندوستان کی مختلف لائبریریاں دیکھنے کا جب موقع ملا تو یہ مسئلہ بھی میرے سامنے تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو مواد میں ہندوستان کی تقریباً سبھی بڑی لائبریریاں دیکھنے کے بعد اکٹھا کر سکا ہوں اور اس سے جو نتائج اخذ کر سکا ہوں وہ ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

فسانۂ لطافت بار یا سیر کہسار سرشار کی ایک تصنیف کا نام ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے محرکات کیا تھے اس سلسلہ میں وہ خط قابل ذکر ہے جو فسانۂ جدید کے اختتام پر دسمبر ۱۸۸۸ء کے رسالہ میں چھپا تھا۔

"جانِ تازہ یافت قالبِ پژمردۂ سخن
این حرکتِ جنبشِ لبِ معجز بیانِ کیست

غازہ کشِ عذارِ فصاحت جناب پنڈت رتن ناتھ صاحب سلامت۔ اب فرمایئے کہ فسانۂ جدید تو ختم ہوا مگر اس کے بعد کوئی اور فسانہ بھی لکھیے گا یا بس۔ میاں آزاد کی داستان رنگین تو ابھی بوستان خیال کی طرح کئی جلدوں میں کئی برسوں کے بعد ختم ہوئی لیکن ایک نہ ایک فسانہ اس داستان دلکش کے طرز پر ضرور شروع کر دیجیے ہم خرما و ہم ثواب۔ لطف کا لطف اور نصیحت کی نصیحت۔

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

امید ہے کہ ہماری تمناؤں کا خون نہ کیجیے گا آئندہ اختیار بدستِ مختار راقم درویش"

(ماخوذ از فسانۂ جدید صفحہ ۸ رسالہ نمبر ۲ ماہ دسمبر ۱۸۸۸ء)

اس خط سے تین باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں اول یہ کہ فسانۂ جدید کے ختم ہونے پر شائقین نئے فسانہ کا مطالبہ کرنے لگے دوسرے یہ کہ وہ فسانۂ آزاد کو بوستان خیال کے ہم پلہ خیال کرتے تھے اور تیسرے فسانۂ جدید کے مقابلہ میں فسانۂ آزاد کی روش کو زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ سماجی محرکات کے علاوہ فسانۂ آزاد کی مقبولیت، شائقین کا اصرار، مطبع نولکشور کی مالی منفعت اور سرشار کی اقتصادی ضرورتوں نے سرشار کو سیر کہسار لکھنے پر مجبور کیا چونکہ قارئین کو فسانۂ آزاد کا انداز بیان زیادہ پسند تھا اور فسانۂ جدید نسبتاً کم مقبول ہوا تھا نیز اس کا معاوضہ انھیں کالموں کے حساب سے ملتا تھا اس لیے انھوں نے فسانۂ آزاد کے انداز کو ملحوظ رکھا اسی لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سیر کہسار کی تعمیر فسانۂ آزاد کے بچے ہوئے روڑے سے ہوئی۔ لیکن اسے سرشار نے ضائع نہیں جانے دیا بلکہ فسانۂ آزاد کے مقابلہ میں زیادہ سلیقہ اور بہتر طریقہ سے استعمال کیا۔ فسانۂ آزاد کی تصنیف کے دوران سرشار کو اودھ اخبار کے اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے اور اس وقت ان کا مقصد کسی باقاعدہ تصنیف کا نہیں تھا بلکہ ان کے فرائض میں اودھ اخبار کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنا کر عوام میں مقبول بنانا اور اشاعت بڑھانا تھا۔ سیر کہسار کی تصنیف کے وقت انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع ملا۔ طبیعت میں جو چھلکا دور امنگ اور جوش کی کیفیت تھی وہ فسانۂ آزاد کی تخلیق میں کام آ چکی تھی۔ سابقہ تجربات قارئین کے مشوروں سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے سابقہ دونوں ناولوں کی نسبت سیر کہسار میں زیادہ نظم و ضبط اور واضح مقصد پایا جاتا ہے۔ داستانی اثر بھی کم ہے۔ گو اس میں وہ خوجی جیسا جاندار کردار تخلیق نہیں کر سکے۔ گو اکثر بیانات بھی فسانۂ آزاد کی طرح طول ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فنی لحاظ سے زیادہ مکمل ہے۔ اس میں زندگی کا عکس حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ ان کی جو حسرتیں اور تمنائیں تھیں وہ فسانۂ آزاد میں میاں آزاد کے ذریعہ تکمیل پا چکی تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سیر کہسار میں آزاد جیسا مثالی اور آئیڈیل کردار نہیں ہے۔ اور یہاں ان کا فن شخصی جذبات یا فکر پر غالب آ گیا ہے۔ اس کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے یہاں میرا مقصد صرف سیر کہسار کی تصنیف اور اشاعتوں سے بحث کرنا ہے۔

سیر کہسار کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی سابقہ دو ناولوں کی طرح "فسانۂ لطیف" کے نام سے اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوا تھا لیکن کب شائع ہوا تھا؟ کیا یہ ماہوار رسائل کی شکل میں بھی طبع ہوا تھا؟ اور کیا اس کا نام یہی تھا؟ اس کے بارے میں سرشار کے سب ناقدین خاموش ہیں اور مجھے بھی اپنی ناکامی کا اعتراف ہے۔ لیکن کتابی شکل میں اس کی مکمل اشاعت دو جلدوں میں ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگست ۱۸۸۸ء سے قبل یہ تصنیف کیا جا چکا تھا۔ کیونکہ جام سرشار کے پہلے ایڈیشن جولائی ۱۸۸۸ء کے سرورق مطبوعہ اگست ۱۸۸۰ء میں سرشار کی دیگر تصانیف کے ساتھ سیر کہسار کا نام بھی دیا گیا ہے۔

"پنڈت رتن ناتھ صاحب در لکھنوی متخلص بہ سرشار
مصنف فسانۂ آزاد و شمس الضحیٰ و سیر کہسار و ترجمۂ الف
لیلہ و سیر وغیرہ"

(سرورق جام سرشار اگست ۱۸۸۸ء)

اس اقتباس میں اس کا نام "فسانۂ لطافت بار و سیر کہسار" کے بجائے صرف "سیر کہسار" دیا ہے پھر فسانۂ لطافت بار کا اضافہ کیسے ہوا۔ یہ غالباً محض تجنیس کے طور پر استعمال ہوا ہے فسانہ کا نام تو

"سیر کہسار" ہی تھا اس کا قافیہ "فسانۂ لطافت بار" زمانے کے رواج کے مطابق خواہ مخواہ بڑھا دیا گیا۔ اس کا امکان کہ یہ ناول پہلی مرتبہ اودھ اخبار میں فسانۂ لطافت بار کے نام سے شائع ہوا ہو کم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت کوئی نام ہی نہ رکھا گیا ہو جیسا کہ فسانۂ آزاد بھی ابتدا میں بغیر کسی عنوان کے شائع ہوا تھا اور دوسرے ناول کا نام فسانۂ جدید بھی قارئین کو یہ بتانے کے لیے ہے کہ فسانۂ آزاد کے بعد اب یہ نیا افسانہ شروع کیا گیا ہے۔ اسے بھی مستقل عنوان سمجھنا غلط ہوگا۔ یہاں جدید سے مراد "نیا" ہی تھی۔ کیونکہ فسانۂ جدید کی اشاعت کے دوران فسانۂ آزاد بھی دور ثانی میں قسط وار اودھ اخبار کے ساتھ چھپ رہا تھا۔ اسی لیے یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ ابتدا میں یہ بغیر کسی نام کے شائع ہوا اور چونکہ پہلی قسط میں سیر کہسار کا ذکر ہے۔ اس لیے سیر کہسار اس قسط کے عنوان کے طور پر لکھا گیا اور باقی قسطیں دیگر عنوانات کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ چونکہ ابتدا میں پہلی قسط سیر کہسار کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس لیے لوگ اسے سیر کہسار کے نام سے ہی پکارنے لگے جو حقیقت میں اس ناول کا نام نہیں بلکہ پہلی قسط کا عنوان ہو سکتا ہے اور جب اس ناول کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا گیا تو نام کی تلاش کی گئی اور اس کا نام سیر کہسار رکھا گیا۔ اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ اس وقت جبکہ ناول کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا تھا "جام سرشار" کے سرورق مطبوعہ اگست ۱۸۸۸ء پر دیگر تصانیف کے ساتھ اس کا نام صرف سیر کہسار لکھا گیا ہے فسانۂ لطافت بار سیر کہسار نہیں لکھا گیا مزید آں کہ سرورق کی یہ عبارت۔

"فسانۂ لطافت بار

جلد اول

سیر کہسار

کہ ہندوستان کے فخر و افتخار مشہور روزگار پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی کی بحر مواج طبع کا ایک لہرا ہے۔

دکان جواہر سخن ہے لاریب
ہے نام رتن ناتھ بھی موزوں تیرا

بار اول ۱۸۹۰ء بمقام لکھنؤ مطبع اودھ اخبار میں حسن طبع سے مزین ہوا"

"فسانۂ لطافت بار

جلد دوم

سیر کہسار

کہ ہندوستان کے فخر و افتخار مشہور روزگار پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی کے بحر مواج طبع کا لہرا ہے۔

. . . .

بار اول ماہ جولائی ۱۸۹۰ء بمقام لکھنؤ مطبع اودھ اخبار میں حسن طبع سے مزین ہوا"

سیر کہسار کے پہلے ایڈیشن کی یہ دونوں جلدیں کتب خانہ محمد عسکری نقوی مصحفی پوری ۱۳۱۸ھ کی ہیں کتب خانہ کی ربڑ اور پنسل کی مہریں جلدوں پر موجود ہیں۔ یہ ذخیرہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کی لائبریری میں آ گیا ہے۔ اس کتاب پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

"یہ کتب عسکری صاحب نے بہ قیمت ۴/۸ (چار روپے آٹھ آنے) ۲۳ جنوری ۱۸۹۳ء کو مطبع نولکشور سے خریدی تھی"

سرورق کی اس عبارت سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس ناول کا نام سیر کہسار تھا اور فسانۂ لطافت بار توصیفی ہے کیونکہ فسانۂ آزاد کی جتنی بھی جلدیں مطبع نولکشور سے چھپی ہیں اس میں نام کے بجائے جلد نمبر پہلے تحریر کیا گیا ہے جیسے جلد اول فسانۂ آزاد، جلد دوم فسانۂ آزاد، جلد سوم فسانۂ آزاد، جلد چہارم فسانۂ آزاد۔ چونکہ سیر کہسار بھی دو جلدوں میں تھا اس لیے جلد اول سیر کہسار، جلد دوم سیر کہسار تحریر کیا گیا۔

فہرست کتب منشی نولکشور لکھنؤ ۳۰ر اپریل ۱۸۹۱ء اور اب ۱۹۶۶ء کی فہرست میں بھی اس کا نام صرف سیر کہسار ہی لکھا گیا ہے۔

سیر کہسار کا پہلا ایڈیشن جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے۔ دو جلدوں میں ۱۸۹۰ء میں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے چھپا تھا۔ اس کا سائز ۱۱ × ۹ تھا جو فسانۂ آزاد کا ہے اور کاغذ سفید تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کب چھپا معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں باہتمام منوہر لال اور چوتھا اور آخری ایڈیشن جلد اول ۱۹۳۴ء جلد دوم اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوا۔ اس کا سائز ۱۰×۶½ ہے۔ دو کالم مسطر ۲۷ سطری ہے صفحات جلد اول ۴۹۶ جلد دوم ۷۰۰ کل صفحات ۱۱۹۶ ہیں۔ پہلے ایڈیشن کی قیمت جیسا کہ محمد عسکری صاحب والے نسخہ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔ چار روپیہ آٹھ آنے تھی فہرست کتب راجہ رام کمار بکڈپو وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۶ء کے مطابق قیمت سیر کہسار جلد اول پانچ روپیہ جلد دوم پانچ روپیہ اور تیج کمار بکڈپو وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ کی فہرست کے مطابق سیر کہسار مکمل کی قیمت چھ روپے ہے لیکن ان دونوں کتب خانوں میں یہ کتاب نہیں ملتی اور بازار میں بھی کمیاب ہے۔

مطبع تیج کمار سے سیر کہسار کے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔ سیر کہسار کی تلخیص ناگری رسم الخط میں بسنت کمار رستوگی نے سرسوتی پریس بنارس سے ۱۹۵۲ء میں شائع کرائی تھی اور خوجی کی طرح حاجی بغلول کا قصہ سیر کہسار سے اخذ کر کے کتاب کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے ۱۹۵۵ء میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کرائی ہے۔

. . . .

بنا درد......!

کنول کرشن بالی

بنا درد گر جی سکتا ہو کوئی
آئیے،
اپنے سب دکھ سونپ دے مجھ کو
اور بدلے میں ان کانٹوں کے
میرے دل کی سب خوشیوں، کلیوں، پھولوں سے جھولی بھر لے جائے
آئیے،
دیکھیے،
میں نے کل جو اشکوں سے سینچی تھی
آج کھلی ہے میرے سونے من کے جیون کی وہ کیاری
—— رنگ برنگی، نیاری
میں نے ہر دکھ لیے پر واری!!
کیوں روتا ہے غم کا بھار اٹھائے
دکھ چھوڑے، سکھ پائے
سوچیے،
پھر نہ پچھتائے
آئیے،
میں کہہ دیتا ہوں گیت خوشی کا
پر بنا درد گر گا سکتا ہو، گائے

پیاسی دھرتی

ظفر صہبائی

تپ رہی ہے یہ دھرتی
اپنے جنم سے اب تک
پیاس اس کا سپنا ہے
پیاس اس کا جیون ہے
اس کی گود میں اب تک
کوئی گل نہیں مہکا
یوں تو کتنی برساتیں
اس پہ ٹوٹ کر برسیں
پھر بھی پیاس باقی ہے
سوچتی ہوں میں اک بار
ایسی برسے اک برسات
بجھتی پیاسی دھرتی کی
ساری پیاس بجھ جائے
سونی گود میں اس کی
کوئی پھول کھل جائے

غزلیں

عتیق حنفی

ہے نور خدا بھی یہیں عرفان خدا بھی
یہ ذات کہ ہے وادئ سینا بھی حرا بھی

اس بن میں کیا کرتا ہے تپ میرا انا بھی
اس شہر میں ہے کارگہہ ارض و سما بھی

کرتا ہوں طواف اپنا تو ملتی ہے نئی راہ
قبلہ بھی ہے یہ ذات مرا قبلہ نما بھی

کرتی ہے مکرر سفر یہ بھی یہی ذات
جب دور نکل جاتا ہوں تو دیتی ہے صدا بھی

خود آگہی و خود نگہی کا ہے یہ انعام
اور جرم شناسائی عالم کی سزا بھی

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرا احساس
جو دیکھتی رہتی ہے مری آنکھ لہو کا بھی

ذرے میں ہے کونین تو کونین ہے ذرہ
کچھ ہے مجھے اندازۂ افلاک پتا بھی

زبیر گنجاہی

کسی کی ہر ادائے جانستاں کو یاد کرتے ہیں
ستم جس نے کیے اس مہرباں کو یاد کرتے ہیں

بس اب اتنا تعلق رہ گیا ہے اپنا گلشن سے
قفس میں بیٹھ کر ہم آشیاں کو یاد کرتے ہیں

سر راہ وفا ناکامئ تقدیر کیا کہیے
بچھڑ کر کارواں سے کارواں کو یاد کرتے ہیں

مبارک شیخ کو کعبہ صنم خانہ برہمن کو
مرے سجدے تمہارے آستاں کو یاد کرتے ہیں

پریشاں پھول آوارہ ہوا میں دام گل چیں کے
یہ سب جیسے ہمارے آشیاں کو یاد کرتے ہیں

نظر آتی ہے خاک اڑتی ہوئی جب آشیانے کی
تو ہم بے ساختہ برق تپاں کو یاد کرتے ہیں

زبیر اس آستانے کی زیارت کو چلو تم بھی
جہاں بندے خدا کے دو جہاں کو یاد کرتے ہیں

اشفاق احمد اعظمی

اس موڑ پر زندگی کا بھی عجب معیار ہے
ہر نفس بے جان جیسے ہر نظر بیمار ہے

برف کا ٹکڑا ہے جیسے آج کے انساں کا دل
جسم جیسے ایک پتھر کی بنی دیوار ہے

سوچتا ہے دل کے سناٹوں میں جذب عشق اگر
جاگتا ہے جسم آنکھوں میں ہوس بیدار ہے

عمر کا اک چھوٹا سا ٹکڑا اور صدیوں کا سفر
ہائے رنجش زندگی بھی کتنا کم رفتار ہے

کتنے طوفانوں سے لے دل کھیلتے ہیں بے جھجک
کتنے طوفانوں سے اپنی زندگی دوچار ہے

مر رہا ہے عہد ماضی کا اگر کہنہ نظام
دور حاضر کی [illegible] بیمار ہے

فضا کوثری

ہم وہاں تک رسے ... اگر تحلیل ہو جائے
تو رنگ سخن جو آج ہے تبدیل ہو جائے

وہ مدح زلف و رخ میں شعر کہہ کر جلتے ہیں یہ
ہمارا نام راہ فن میں سنگ میل ہو جائے

فضا ناکام رہنا ہی مگر معراج الفت ہے
محبت کیا محبت کی اگر تکمیل ہو جائے

محبوب راہی

دن کی روشنی تنہا شب کی تیرگی تنہا
اف خیال تنہائی لگتے ہیں سبھی تنہا

عمر بھر رہا ایک پل بھی نہ دل کی تنہا
اے خوشا نصیب اپنے محبت لگی تنہا

اور پھر تو لانا ... بارگاہ یزداں میں
کیسے کام آئے گی صرف بندگی تنہا

مشکلیں یقینی ہیں راہ شوق میں راہی
ساتھ قافلوں کے ہو یا چلے کوئی تنہا

ہما میرٹھی

آئینۂ حقیقت ...... (الف)

ہماری زبان بابت ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کے صفحات ۳ و ۴ پر دیریندر پرشاد سکسینہ کا ایک مقالہ "سرور جہاں آبادی اور شاکر میرٹھی" شایع ہوا ہے۔ مقالۂ ہٰذا کا تعلق میرے مقالے آئینۂ حقیقت مطبوعہ اردو ادب شمارہ (۱) ۱۹۶۶ء سے ہے یہ مقالہ سرور جہاں آبادی مرحوم کی وکالت میں قلمبند فرمایا گیا ہے۔

سکسینہ صاحب نے اپنی دانست میں میرے مقالے آئینۂ حقیقت کا مدلل جواب دیدیا ہے۔ اپنے مقالے میں سکسینہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے۔

(۱) "سرور جہاں آبادی نے شاکر میرٹھی کو رتو سنگار یعنی کالی داس کی موسمی نظموں کا ترجمہ اکسیر سخن کے نام سے ۱۹۰۹ء میں مکمل منظوم کر کے پچیس روپیے کے معاوضے کے بعد شاکر مرحوم کو دیدیا تھا"

(۲) "سرور پر مقالہ لکھتے ہوئے حضرت جگر بریلوی رقمطراز ہیں۔ آپ کی بہت سی نظمیں اور بے شمار رباعیاں مسٹر پیارے لعل شاکر میرٹھی کے نام سے شایع ہوئیں۔ انھیں نظموں میں ایک مجموعہ اکسیر سخن ہے"

(۳) "شاکر میرٹھی سے میری ملاقات پانچ سات بار ہوئی۔ میں نے ان کے پاس سرور مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ دیکھا تھا۔ جس میں پانسو رباعیاں اور ڈیڑھ سو نظمیں تھیں۔ جن میں سے تقریباً دو سو رباعیاں اور پچاس نظمیں شاکر صاحب نے اپنے نام سے شایع کرادیں۔ اگر ہما صاحب اس بحث کو جاری رکھیں گے تو میں نظموں کے نام بھی پیش کر دوں گا"

(۴) "سرور جہاں آبادی شاکر میرٹھی سے اصلاح لیتے تھے یا شاکر میرٹھی سرور جہاں آبادی سے"

(۵) "آئینۂ حقیقت میں خواجہ سائل صاحب کی ایک تحریر درج ہے اس میں دھوکے سے انھوں نے پر بھودیال عاشق کو سیتا پوری لکھدیا ہے۔ حالانکہ وہ لکھنوی تھے"

(۶) "کالی داس کی نظموں کا سنسکرت سے ترجمہ مسٹر شاکر نے ایک پنڈت صاحب کی مدد سے نثر میں بطور خاکہ کیا تھا اور سرور اسے نظم کرتے تھے۔ شاعر کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ جو کچھ نظم کرتا ہے خواہ وہ کسی دوسرے ہی کے لیے کیوں نہ ہو لیکن اسے بھر ازدوستوں کو ضرور سنا دیتا ہے۔ سرور بھی مجھے ان نظموں کے اشعار روزمرہ سنایا کرتے تھے۔ مجھ سے یہ راز پوشیدہ نہ تھا کہ مسٹر شاکر کی نظمیں دراصل سرور کے زورِ طبع کا نتیجہ ہوتی ہیں"

آئینۂ حقیقت لکھ کر میں نے علاوہ اور باتوں کے یہ بات ثابت کردی ہے کہ جناب شاکر میرٹھی مرحوم خود شاعر تھے چنانچہ ان کی ادبی و شاعرانہ زندگی میں جو کچھ بھی انھوں نے لکھا ہے اس کا ایک منفرد رنگ ہے اور وہ رنگ ہر جگہ ان کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سرور مرحوم کی وفات سے پہلے اور وفات کے بعد بھی جناب شاکر مرحوم مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں اور ان میں کچھ مشاعرے طرحی مشاعرے بھی تھے۔ شاکر صاحب کی طرحی غزلیں بھی ان کے اسی منفرد رنگ و اسلوب میں کہی گئی ہیں۔ مذہب کے اعتبار سے شاکر صاحب ایک غیور مسیحی تھے۔ مسیحی دینیات پر بھی ان کا دافر کلام شایع ہوا ہے جو خالص مسیحی تخیل کا عکس ہے اور وہ لازوال علمی و ادبی خزانہ بھی شاکر صاحب کے اسی منفرد رنگ میں ہے۔ اگر شاکر صاحب نے رتو سنگار کا منظوم ترجمہ بعنوان اکسیر سخن مرحوم سرور سے کروایا تھا تو اس کے بعد کا ان کا جو طرحی کلام۔ فرمائشی کلام۔ قطعاتِ تاریخ (جس کے فن سے سرور مرحوم قطعی نابلد تھے) مذہبی کلام۔ مختلف مسیحی تقریبوں کے لیے خصوصی کلام جو کسی خاص برس سے ہی متعلق ہے۔ سرور صاحب کی وفات کے بعد وہ کس سے لکھاتے رہے۔ لطف یہ ہے کہ اس تمام کلام کا ایک ہی رنگ ہے۔

ان واقعات کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی یہ بات پھر دہرانی پڑے گی کہ شاکر صاحب کوئی PLANCHETEER تو تھے نہیں جو سرور مرحوم کی روح کو پلانچٹ کی طشتری پر بلوا کر اس سے یہ کلام جو کہیں کہیں سرور مرحوم کے دینی عقاید کے بھی خلاف تھا لکھوا لیتے ہوں۔

حضرت جگر بریلوی۔ منشی دیا نرائن نگم۔ منشی نوبت رائے نظر مرحوم اور کچھ اور صاحبان کے ذاتی تعلقات حضرت شاکر میرٹھی مرحوم سے ان کی زندگی میں کیسے رہے ہیں اس کے لیے مجھے پھر سے پرانی باتوں کو دہرانا پڑے گا۔ میں گریز کروں بھی تو کیسے۔ آخر سکسینہ صاحب کی تسلی ہونا بھی ضروری ہے اور ان کی تسلی کے بہانے سے اردو علم و ادب کی دنیا کو بھی کچھ ان روح فرسا حقایق سے واقفیت ہو جائے گی۔ بہرحال سکسینہ صاحب اور قارئین مطمئن رہیں۔ یہ حقایق بھی سامنے آجائیں گے۔

سردست میں سکسینہ صاحب کو اور ان کے ہم خیال اصحاب کو دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ شاکر مرحوم کے خلاف وہ جو کچھ بھی لکھنا چاہیں بعد شوق لکھیں۔ تاکہ میں بوقتِ فرصت ان سب دلائل کو آئینۂ حقیقت کی اگلی قسط میں ذکر دے سکوں۔

دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء میں شاکر صاحب کے نام سے رتو سنگار کی کچھ نظمیں شایع ہوچکی تھیں

بات بالکل صاف ہے کہ سرور مرحوم کی حیات ہی میں شاکر صاحب کے نام سے رتو سنگار کا کچھ حصہ منظرِ عام پر آچکا تھا۔ سرور صاحب مرحوم کا کلام ملک کے مختلف ادبی جرائد میں اس وقت شایع ہوتا رہتا تھا اور وہ چاہتے تو اس سلسلے میں تردید بھی کر سکتے تھے کہ وہ نظمیں شاکر صاحب کی زورِ طبع کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ خود سرور صاحب کی نگارشات جمیلہ ہیں۔ مگر سرور مرحوم کو اس کی ضرورت درپیش کیوں آتی جبکہ وہ خود واقف تھے کہ رتو سنگار والی نظموں کے مصنف شاکر صاحب اور صرف شاکر صاحب ہی ہیں۔

سکینہ صاحب نے قدرے گرج اور کڑک کے ساتھ لکھا ہے کہ اگر کوئی صاحب اس بحث کو طول دینا چاہیں تو مثالیں میں پیش کرنے کو تیار ہوں۔ اگر سکینہ صاحب کے پاس پیش کرنے کو مثالیں موجود ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے یہ تو کارِ خیر ہے ؏

چشم ما روشن دلِ ما شاد

سکینہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ شاکر میرٹھی سے میری ملاقات پانچ سات بار ہوئی۔ میں نے ان کے پاس سرور مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ دیکھا تھا جس میں پانسو رباعیاں اور ڈیڑھ سو نظمیں تھیں...... اگر چہ صاحب اس بحث کو جاری رکھیں گے تو میں نظموں کے نام بھی پیش کر دوں گا۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ سکینہ صاحب نے اس راز کو شاکر صاحب کی حیات ہی میں کیوں ظاہر نہیں کیا۔ بہرحال سکینہ صاحب کو میری طرف سے کھلی دعوت ہے کہ وہ ان نظموں کے نام ضرور ظاہر فرما دیں۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کنونت کہ امکانِ گفتار است
بگوائے برادر بہ لطف و خوشی
کہ فردا چوں پیکِ اجل در رسد
بحکمِ ضرورت زباں در کشی

انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے اور پھر نیک کام میں دیر مناسب بھی نہیں ہوتی۔ بفضلہٖ سکینہ صاحب ابھی بقیدِ حیات ہیں لہٰذا یہی نہیں بلکہ انھیں اس سلسلے میں اور بھی جو کچھ کہنا ہے یا جو ثبوت پیش کرنے ہیں وہ انھیں بھی احاطۂ تحریر میں لائیں تاکہ ان سب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بحث کی جاسکے اور کوئی فیصلہ ہو سکے۔

۵ مارچ ۱۹۰۰ء کو شاکر صاحب نے الٰہ آباد سے جو خط مسٹر نگم کو لکھا تھا وہ دراصل مسٹر نگم کے ایک خط کا جواب تھا۔ مسٹر نگم نے اپنے خط میں کچھ اس قسم کے شکوک کا اظہار فرمایا ہوگا۔ کہ شاکر صاحب کے کلام میں سرور کے رنگ کی جھلک نظر آرہی ہے چنانچہ شاکر صاحب کی تحریر میں مسٹر نگم کے کسی ایسے ہی جملے کا جواب موجود ہے۔ بیشتر عرض کر چکا ہوں کہ شاکر صاحب اور مسٹر نگم کے تعلقات کے بارے میں کچھ پرانی باتیں دہرانی پڑیں گی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسٹر نگم ۱۹۱۰ء میں شاکر مرحوم کے بارے میں اس قسم کے خیالات دل میں رکھتے تھے۔ مسٹر نگم کے خط کے جواب میں شاکر مرحوم کا یہ جملہ "سرور صاحب کا رنگ بھلا میں کیا اڑا سکتا ہوں" انکسار کے علاوہ طنز بھی پوشیدہ رکھتا ہے کیونکہ سرور اور شاکر دونوں کے رنگِ سخن میں دراصل زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شاکر صاحب کا یہ جملہ "اگر نوٹ لکھیں تو اس میں اس قسم کی داد نہ دیجیے گا" بھی ایک طنزیہ جملہ ہے۔ شاکر مرحوم جیسا جیّد شاعر اور کامل ادیب جو تقلید کو بھی دھبہ سمجھتا ہو۔ سرور مرحوم کے کلام سے کیا استفادہ اٹھاتے اور پھر سرور مرحوم تو سنسکرت سے بھی ناواقفِ محض تھے۔ اگر نگم مرحوم کی عبارت صحیح بھی تسلیم کر لی جائے کہ کالی داس کی نظموں کا سنسکرت سے ترجمہ مسٹر شاکر نے ایک پنڈت کی مدد سے نثر میں بطور خاکہ کیا تھا اور سرور صاحب ہی اسے نظم کی شکل دیتے تھے تو بھی یہی کہا جائے گا کہ سرور مرحوم شاکر صاحب سے مشورہ لیتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاکر صاحب کی پچاس پچپن سالہ علمی و ادبی زندگی میں شاکر صاحب کا جو کلام شایع ہوا ہے اس کا رنگ ایک ہی ہے اور وہ رنگ بہر طور سرور مرحوم کے رنگ سے قطعی الگ ہے۔ وہ رنگ شاکر مرحوم کا ہے اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اکثر سخن میں شاکر صاحب کا یہی منفرد رنگ جلوہ گر ہے۔

مراسلات

ایک استفسار کا جواب

۲۲ر اکتوبر ۷۶ء کے اخبار ہماری زبان میں اکبر علی خاں صاحب نے یہ سوال پوچھا ہے کہ کیا مرقع شعرا جعلی ہے، اور اس کے جواب کی خواہش مجھ سے بھی کی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ یہ چند ورق جو مرقع شعرا کے نام سے شایع کیے گئے ہیں وہ مرحوم رام بابو سکسینہ کو کس طرح دستیاب ہوئے۔ مولوی عبدالباری آسی مرحوم نولکشور بک ڈپو میں ملازم تھے اور اس کے ساتھ ساتھ کتابوں کی خرید و فروخت بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے سندیلہ ضلع ہردوئی میں کچھ کتابیں خریدیں۔ ان میں ایک مصوّر تذکرۂ شعرا کے دس ورق بھی تھے جو انھوں نے مجھ کو دکھائے اور میں نے ان کی اجازت سے لکھنؤ کے دو شاعروں کی تصویروں کی نقل مطابق اصل بنوالی۔ وہ شاعر ہیں رائے ٹیکا رام تسلی اور لالہ کرپا دیال عرف کنور سین مضطر۔ کچھ دن بعد رام بابو سکسینہ صاحب مجھ سے ملنے آئے اور اثنائے گفتگو میں میں نے ان ورقوں کا ذکر کیا۔ وہ دس ورق انھوں نے دو سو روپے کے خرید لیے اور ان کی اشاعت کے ارادے سے ان کی عکسی نقل تیار کروالی۔ قلمی نقل میں مجھ سے مدد لی جس کا شکریہ انھوں نے مرقع شعرا کے مختصر انگریزی دیباچے میں ادا کیا ہے۔ ابتدا میں ان اوراق کو مصنف تذکرہ کے اصل نسخے کا جز سمجھ کر میں نے تصویروں کو بہت اہمیت دی۔ مصنف نے مرزا مظہر کے حال میں لکھا ہے کہ تذکرے میں حالات اور تصویریں ان لوگوں کی ہیں جن سے میرے روابط ہیں یا جن سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن مرزا مظہر کی سچی تصویر بادر چیسٹر مل کے مرقع میں نظر آئی تو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لا محالہ ان کا مختصر حال تذکرے میں درج کر دیا۔ اس بیان سے تصویروں کی اصلیت شک و شبہہ سے بالاتر معلوم ہوئی۔ لیکن بعد کو غائر نظر سے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تذکرے کے اصل ورق نہیں ہیں، بلکہ ان کی نقل ہیں اور ان کی کتابت زمانۂ تالیف سے بہت دن بعد ہوئی ہے۔ یعنی کتابت کی خصوصیتوں پر غور کر کے اکبر علی خاں صاحب نے جو نتیجہ نکالا ہے میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن اس سے تذکرے کی اہمیت کم نہیں ہوتی اور اس کو جعلی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں تصویروں کے بارے میں جعل کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ مجھ کو یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ تصویریں فرضی ہیں۔ اس شبے کی ابتدا میر کی تصویر سے ہوئی جو لکھنوی پیٹا کی ہے۔ میر کی افتاد مزاج سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر اپنی وضع میں ایسی نمایاں تبدیلی کر لی ہو۔ قدسی ملا حیدری کی تصویر نے اس شبے کو اور قوی کر دیا۔ تذکرہ نویس نے قدسی کو امرد پرست بتایا ہے۔ اس بنا پر مصور نے اس کی تصویر کے ساتھ ایک امرد کی تصویر بھی بنا دی ہے۔ اس عہد کا کوئی شکیل شخص اپنی ایسی تصویر پسند نہیں کر سکتا تھا جو اس کی امرد پرستی کا اعلان کرتی ہو۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ تصویریں فرضی ہیں اور بہت بعد کو بنائی گئی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مرقع شعرا میں شاعروں کے حالات میں کوئی جعل نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ اس کی تصویریں کل یا بعض فرضی ہوں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

گجراتی میں اردو الفاظ

یکم ستمبر کے "ہماری زبان" میں جناب عادل منصوری کا ایک مراسلہ "اردو اور گجراتی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے جناب اعجاز صدیقی کے ۸ر اگست کے "ہماری زبان" میں شائع شدہ جشن حزیں احمد آباد کے مشاعرے کی تقریر میں پیش کی گئی گجراتی الفاظ کی مختصر فہرست سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

عادل منصوری نے اعجاز صدیقی کی پیش کردہ فہرست میں سے کچھ الفاظ منتخب کر کے ان کے مقابلے میں گجراتی زبان کے الفاظ دیے ہیں جس سے قارئین میں غلط فہمی پھیلنے کا امکان ہے۔ عادل منصوری نے اعجاز صاحب کے الفاظ کے مقابل جو الفاظ رکھے ہیں وہ دو تین کے علاوہ تمام کے تمام سنسکرت زبان کے الفاظ ہیں جو گجراتی لغات کے کاغذ پر تو موجود ہیں مگر گجرات کی پانچ فیصدی آبادی بھی نہ انھیں بولتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے۔ عادل صاحب کے پیش کیے ہوئے چند الفاظ کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) گرم کے مقابل۔ اشن (سنسکرت)، یہ لفظ صرف گجرات کے ریڈیو سے موسم کے حال میں) بولا جاتا ہے دوسرا کوئی نہیں بولتا اور نہ لکھتا ہے۔ خود عادل صاحب بھی نہیں بولتے۔ کیا وہ ایسا بولنا پسند کریں گے کہ چائے اشن لانا۔ یا کھانا اشن کر کے لاؤ وغیرہ۔

(۲) یاد کے مقابل سمرتی (سنسکرت)، یاد کے مقابل سمرتی نہ کوئی بولتا ہے نہ لکھتا ہے یہ لفظ قطعی رائج نہیں ہے عادل صاحب زبردستی یہ لفظ ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۳) شکار کے مقابل بھکش (سنسکرت)، یہ لفظ بھی قطعی غیر مروج ہے۔ گجرات کے سبھی لوگ شکار کو شکار ہی بولتے ہیں بھکش کوئی نہیں بولتا۔ یوں تو بولا جائے گا کہ میں شکار کرنے جا رہا ہوں یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں بھکش کرنے جا رہا ہوں۔ گجرات کے لوگ شکار اور بھکش کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

(۴) جام کے مقابل سرا پاتر (سنسکرت)، سرا پاتر گجراتی زبان کے کسی اگلے شاعر نے اپنی کویتا میں لکھا ہو تو ممکن ہے۔ مگر عام طور پر کہیں بولا یا لکھا نہیں جاتا۔ گجراتی زبان میں عام طور پر پانی پینے کے گلاس کو بھی جام کہتے ہیں۔

(۵) سلامت کے مقابل رکشت (سنسکرت)، رکشت کا مطلب حفاظت کیا گیا یا جس کی حفاظت کی جا رہی ہو ایسا ہوتا ہے۔ سلامت سے اس کا کیا تعلق؟

(۶) مصیبت کے مقابل اپادھی (سنسکرت)، اپادھی کے معنی

فکر، جنجال، تکلیف وغیرہ کے ہیں۔ مصیبت اور اپاودھی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ عادل صاحب زبردستی یہ لفظ ٹھونس کر غلط فہمی کیوں پھیلا رہے ہیں؟

(۷) خوشی کے مقابل ہرش (سنسکرت)، خوشی میں جو وسعت ہے وہ ہرش میں ہرگز نہیں ہے۔ میں نے انھیں خوش کر دیا، میں بہت خوش ہوں کے استعمال کے وقت ہرش کو بدل کر ہرشت کر دینا پڑے گا۔ ہرشت کے بغیر مطلب ادا نہیں ہوگا۔ اعجاز صاحب نے خوشی کے مقابل آنند بھی لکھا تھا جو بہت ہی موزوں ہے۔ عام طور پر خوشی یا آنند ہی بولا جاتا ہے۔

(۸) خبر کے مقابل سماچار (سنسکرت)، خبر میں جو وسعت ہے وہ سماچار میں ہو ہی نہیں سکتی۔ سماچار لفظ خبر کا بار اٹھا ہی نہیں سکتا۔ جیسے کہ اگر آپ کو یہ بولنا ہوگا کہ "تم اس چیز سے بے خبر ہو" تو کیا آپ یہ بولیں گے کہ آپ اس سے بے سماچار ہو"؟ یا پھر اگر آپ کو یہ بولنا ہوگا کہ کس کو خبر یعنی (کون جانے)، تو آپ کیا بولیں گے؟ یہ سراسر زیادتی ہے، جبکہ عادل صاحب خود اخبار کے رپورٹر کو خبر پتری لکھنے پر مجبور ہیں۔

(۹) ملاقات کے مقابل ملن (سنسکرت)، ملن کا عام مطلب ملنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے ملاقات کرنے جا رہے ہوں گے تو آپ یہی بولیں گے کہ میں فلاں صاحب سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں یہ ہرگز نہیں بولیں گے کہ میں فلاں صاحب سے ملن کرنے جا رہا ہوں۔ ملاقات اور ملن کا کوئی جوڑ نہیں۔ گجراتی میں ملن کے معنی میلاپ تک ہی محدود ہیں ملاقات نہیں۔

(۱۰) حریف کے مقابل پرتی سپردھی (سنسکرت)، عادل صاحب خود ہی بتائیں کہ کیا وہ اس لفظ کو بولتے ہیں؟ اگر بفرض محال وہ بولتے بھی ہیں تو کیا ان کا مخاطب اسے سمجھ پاتا ہے؟ ضرور انھیں اپنے مخاطب کو اس لفظ کے معنی سمجھانے پڑتے ہوں گے۔ حریف میں جو وسعت جو ٹھاٹ اور جو لچک ہے وہ پرتی سپردھی جیسے لٹھ مار لفظ میں کہاں ہے؟

(۱۱) گناہ کے مقابل پاپ (سنسکرت)، پاپ گجراتی زبان میں صرف مذہبی گناہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے زنا، چوری، قتل وغیرہ۔ پولس اور عدالت کی زبان میں آپ گناہ کو پاپ ہرگز نہیں کہہ سکیں گے گناہ ہی کہنا پڑے گا۔

(۱۲) دنیا کے مقابل وشو (سنسکرت)، گجرات میں عام طور پر دنیا کو دنیا ہی بولتے ہیں۔ بین شاعری اور کویتا میں کہیں کہیں وشو نظر آتا ہے مگر بہت کم۔

(۱۳) علاج کے مقابل اپچار (سنسکرت)، اپچار لفظ بھی بہت ہی محدود ہے اور بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے۔ علاج کا جو انداز ہے وہ اپچار کا ہرگز نہیں ہے۔ کیا آپ کسی ڈاکٹر یا حکیم کا علاج کروا رہے ہوں گے تو یہ بول سکیں گے کہ میں فلاں ڈاکٹر کا اپچار کروا رہا ہوں یا فلاں حکیم میرا اپچار کر رہا ہے؟ اس سے تو بہتر ہوتا کہ عادل صاحب سار دوار لکھتے۔

(۱۴) جلدی کے مقابل اتاورٹ - ورنیشیہ) اتاورتو معدودے چند ہی لوگ بولتے ہوں گے عام طور پر جلدی ہی بولا جاتا ہے اس سے عادل صاحب بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جلد کے لیے اگر آپ "اگر" بولیں گے تو شاید ہی کوئی سمجھ پائے گا۔

اعجاز صاحب نے اپنی فہرست میں ۸۴ الفاظ پیش کیے تھے مگر عادل منصوری صاحب نے صرف ۲۱ ہی الفاظ کا احاطہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی و فارسی کے لاتعداد الفاظ گجراتی زبان نے اپنا لیے ہیں اور جو اس کی حیات بن کر رہ گئے ہیں۔

(گلشن بڑودوی)

اقبال کی ایک غزل

"ہماری زبان" کے یکم نومبر ۹۶ء کے شمارہ میں جناب آدم سیتاپوری نے "اقبال کی ایک غزل" کے عنوان سے جو مضمون شائع کرایا ہے اور اپنے مضمون میں ۲ ۹۰ ۱۹ء کے "کلیات اقبال" اور گلدستہ "تصویر یار" کے پہلے شمارہ سے جو غزل اور غزل کا موازنہ پیش کیا ہے اور جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ..... اس غزل کے بقیہ اشعار جو "کلیات" میں نہیں ہیں گلدستہ سے نقل کیے جا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ اشعار اقبال کے کسی اور مجموعے میں بھی شامل نہ ہوں"۔

اطلاعاً عرض ہے کہ مذکورہ غزل "کلیات اقبال" مطبوعہ نیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۲۹ ۱۹۰ دہلی نمبر ۶ کے صفحہ ۹۰ پر درج ہے یہاں گیارہ اشعار کی بجائے دس اشعار ہیں۔ مطلع میں "اس پر" کی بجائے "اسیر" ہی درج ہے یہاں دسوں شعر نقل کر رہا ہوں تاکہ ترتیب کا اندازہ ہو سکے۔ ساتھ ہی پہلا، تیسرا اور چوتھا شعر توجہ طلب ہے ؎

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا	اور اسیر حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا
جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں	مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر	کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلا کیونکر ہوا
ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا	مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے	پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب	وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا
تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل	ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق	چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیونکر ہوا
پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری	ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی	کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا

آدم صاحب لکھتے ہیں یہ غزل گلدستہ تصویر یار بابت ماہ نومبر ۱۹۰۲ء کے صفحات ۲۰-۲۱ پر چھپی ہے۔ لیکن نیو تاج آفس سے شائع شدہ "کلیات اقبال" کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزل ۱۹۰۵ء سے پہلے کی ہے۔ کیونکہ مذکورہ کلیات میں اس غزل کا شمار حصہ اول یعنی ۱۹۰۵ء تک کی غزلوں میں ہے۔ (محمد عاشق ہرگانوی)

اردو کو دلی یوپی بہار پنجاب راجستھان مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش میں سرکاری زبان بنایا جائے

دہلی ۵ نومبر (آئی این) ایک مشترکہ بیان میں ۳۰ سرکردہ افراد نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان کو دلی یوپی بہار پنجاب راجستھان آندھرا پردیش مہاراشٹر میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس بیان پر ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر تارا چند، بیگم انیس قدوائی ایم پی نائب صدر انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ عبدالغنی ڈار ایم پی، پنڈت سندر لال صدر انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کے بھی دستخط ہیں۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ وہ یہ مطالبہ خاص زبان اور کلچر کی بنیاد پر کر رہے ہیں اردو کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو مذکورہ ریاستوں میں اس کا جائز حق دیا جائے۔　(الجمعیۃ)

اردو کو سرکاری زبان بنانے کے مسئلہ پر غور

نئی دہلی ۴ نومبر۔ گذشتہ شب یوپی اور بہار میں اردو کو اس کی حیثیت دینے کے سوال پر اعلیٰ سطح پر بات چیت ہوئی۔ یہ بات چیت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد مسز اندرا گاندھی اور بہار و یوپی کے وزرائے اعلیٰ کے درمیان ہوئی اس بات چیت میں دونوں ریاستوں میں اردو کو اضافی سرکاری زبان کا درجہ دینے کے مطالبہ پر غور کیا گیا۔ اس بات چیت کے موقع پر صدر کانگریس جناب کامراج نادار اور مرکزی وزیر جناب فخر الدین علی احمد بھی موجود تھے۔

جناب کامراج اور مسز اندرا گاندھی دونوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ معلوم ہوا ہے کہ بات چیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ آئندہ چند روز بعد مسز اندرا گاندھی دونوں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے پھر بات چیت کریں گی۔

(الجمعیۃ)

مجلس تحقیقات اردو دہلی یونیورسٹی میں
پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی آمد

دہلی ۲۵ اکتوبر۔ انجمن تحقیقات اردو کا جلسہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام زیر صدارت پروفیسر نور الحسن ہاشمی، صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اردو شاعری میں مومن کا مقام کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی تحقیقی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر ظہیر صدیقی صاحب نے اپنے مقالے میں اس بات پر زور دیا کہ مومن کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت انتہا پسندانہ طریقوں سے قطع نظر کر کے مومن کی شاعری سے شہادتیں حاصل کرنا چاہییں۔

مقالہ کے بعد ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، شہاب جعفری صاحب اور رشید حسن خاں صاحب نے بحث میں حصہ لیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے فرمایا کہ شاعر کو خود اس کے آئینے میں دیکھنا چاہیے اور اس پر غور کرنا چاہیے کہ اپنے بارے اور کلام کے بارے میں شاعر کا کیا خیال ہے۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔

آخر میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(سید ظہیر الحسن۔ سکریٹری)

شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی کا ایک جلسہ

شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ کا ایک جلسہ ترقی پسند ادبی تحریک پر ہوا جس میں جناب علی جواد زیدی صاحب نے بطور مہمان خصوصی کے شرکت فرمائی۔ جناب امیر اللہ خاں شاہین نے مقالہ پڑھا سیمینار کی صدارت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کی۔ جناب علی جواد زیدی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زیدی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں نقاد بھی اور محقق بھی ان کی شاعری وطنیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس میں گہرا تعمیری عنصر دھیما دھیما اور شائستگی کی چاندنی ملتی ہے۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک کے پہلے دستے سے ہے لیکن وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو اور آزادی رائے کا پورا پورا استعمال کر کے تحریک میں اپنی وطن دوستی کو مقدم رکھا۔

ترقی پسند تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب علی جواد صاحب زیدی نے کہا کہ ۱۹۳۵ء کو تحریک کا نقطہ آغاز قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں۔ اس سے بہت پہلے ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ جن کے زیر اثر ترقی پسند خیالات عام ہو رہے تھے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ تحریک فی الواقع کب شروع ہوئی خود سجاد ظہیر، رشید جہاں اور احمد علی بھی ۱۹۳۵ء سے بہت پہلے ترقی پسند ہو چکے تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "انگارے" بھی تین چار برس پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی اور بعد میں لکھنؤ ہی اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز قرار پایا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اشتراکی خیالات کے اثرات اردو ادب پر بھی بہت پہلے سے پڑ رہے تھے۔ اقبال لینن کو خراج عقیدت پیش کر چکے تھے۔ "خضر راہ" ۱۹۲۱ء میں منظر عام پر آ چکی تھی اور حسرت موہانی بھی اپنے بعض اشعار میں اشتراکی اقدار کو پیش کر چکے تھے اور 'سوویٹ' کے ڈانڈے صوفیت سے ملا چکے تھے۔ ترقی پسندی اس زمانے کی فضا میں تھی اس لیے کسی ایک سال کو اس کا نقطہ آغاز قرار دینا خطرہ سے خالی نہ ہوگا۔

مقالہ نگار امیر اللہ خاں شاہین نے ترقی پسند تحریک کے زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان

کی میزان اقدار میں فکر کا پاس سب سے بھاری ہے یعنی انھیں مذہبی فکر اور مذہب سے خاص لگاؤ ہے جب کہ ترقی پسند ادب میں صرف غیر مذہبیت ہی نہیں لامذہبیت بھی ملتی ہے۔ زیدی صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری ہمیشہ مذہب کی سخت گیری کے خلاف رہی ہے اور اس میں ظاہرداری اور خارج پرستی کو ہمیشہ برا بھلا کہا اور رندی اور سرمستی کو قابل فخر ٹھہرایا گیا ہے۔ مولانا آزردہ اور فضل الحق خیرآبادی جیسے راسخ العقیدہ علما مرزا غالب کے دوست تھے لیکن جب غالب نے یہ کہا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تو کوئی بھی برچونکا نہ معترض ہوا کیونکہ آزادخیالی اور مذہبی رسم پرستی کی مخالفت شروع سے اردو شاعری کی امتیازی صفت رہی ہے۔

آزاد نظم کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے علی جواد زیدی نے کہا کہ عام طور پر اس کا ذکر ن۔م۔ راشد کے نام سے شروع کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے عبدالحلیم شرر، عظمت اللہ خاں، نادر کاکوروی اور دوسرے شاعر راشد سے بہت پہلے یعنی بیسویں صدی کے بالکل ہی آغاز میں اس کی ابتدا کر چکے تھے۔ رسالہ "دلگداز" کے فائلوں میں ایسی نظمیں خاصی تعداد میں مل جاتی ہیں۔

اشتراکیت کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے زیدی صاحب نے کہا کہ انقلاب روس کے بعد ہندوستان کے اکثر ذہین لوگ اشتراکیت سے متاثر ہونے لگے تھے۔ جواہرلال نہرو نے اپنے والد موتی لال نہرو کے برعکس اشتراکی خیالات ہی کو اپنایا۔ ایک متحدہ اشتراکی محاذ بن گیا تھا جس میں یوسف مہر علی، آچاریہ نریندر دیو، سمپورنانند، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر وغیرہ بھی شریک تھے اور کانگریس کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل تھے۔ اس زمانہ میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا اجلاس ہوا جس کے پہلے مینی فسٹو میں تقریباً وہ سب باتیں تھیں جنھیں بعد میں ترقی پسند تحریک نے اپنایا۔ حیات اللہ انصاری صاحب کانگریسی اور کٹر مذہبی دونوں تھے لیکن اس زمانے میں ان کے دوست ان کو حیات اللہ روسی کہتے تھے اس لیے کہ وہ روس کے موضوع پر بہت لکھتے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے اندرونی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے زیدی صاحب نے بتایا کہ روس جب تک دوسری جنگ عظیم میں شامل نہ ہوا تھا ترقی پسند ادیب اس جنگ کو سامراجی جنگ کہتے تھے اور اس میں انگریزوں کا ساتھ دینے کے خلاف تھے سردار جعفری نے جنگ کے خلاف نظم لکھی تھی۔ زیدی صاحب نے بتایا کہ اس سبب وہ جیل بھیج دیے گئے۔ وہیں انھیں اطلاع ملی کہ روس بھی جنگ میں شریک ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے یہ بات خاصی حیران کن تھی کہ فوری طور پر اس جنگ کے بارے میں پارٹی کا نظریہ کیسے تبدیل ہو گیا۔ اس سے پہلے جس جنگ کو سامراجی جنگ کہا جاتا تھا اب اسے عوامی جنگ بتایا جانے لگا قوم پرست طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ روس میں جنگ عوامی سہی لیکن ہندوستان کے عوام غلام تھے یہ جنگ کیسے ان کی جنگ ہو گئی۔ زیدی صاحب نے کہا کہ یہ سوال انھیں اور ان کے ساتھیوں کو پریشان کیے ہوئے تھا ترقی پسند تحریک کا رویہ اس معاملے میں چونکہ وطنیت کے خلاف تھا اس لیے وہ اور بعض دوسرے لوگ تحریک سے الگ ہو گئے اور تحریک کا یہی تضاد کھل کر سامنے آگیا تحریک پر سیاسی گرفت رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی گئی۔ بعد میں جب آل احمد سرور نے آنند نرائن ملا کے مجموعۂ کلام پر مقدمہ لکھا تو تحریک کے سرکاری حلقوں سے اس کی مذمت کی گئی۔

آخر میں علی جواد زیدی نے کہا کہ اگرچہ اس تحریک میں کئی خامیاں اور کمزوریاں بھی رہی ہیں لیکن اس کے اکتسابات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اس سے اردو ادب کو ایک نئی توانائی دی تھی۔ سیمینار میں جناب نذیر بنارسی صاحب نے بھی شرکت کی جو اس دن دلی آئے ہوئے تھے ان کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ نذیر بنارسی صاحب اردو کے قومی اور وطنی شاعروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اس کے بعد نذیر بنارسی صاحب نے بنارس کے بارے میں چند قطعات اور اپنی ایک نظم "گنگا کے تین روپ" سنائی۔ سیمینار جناب شریف احمد صاحب کے شکریہ کے ساتھ ختم ہوا۔

(ذبیح اللہ خاں شاہین، سکریٹری بزم ادب)

انجمن ترقی اردو شاخ بھیمڑی کی ادبی نشست

انجمن ترقی اردو بھیمڑی کی جانب سے مختار الرحمن راہی اور آل انڈیا ریڈیو بیدر کے پروگرام ڈائرکٹر جناب راکیش کے اعزاز میں ۲۸ ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو مومن لائبریری میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جو جناب شبیر راہی صاحب کی صدارت میں شروع ہوئی۔

جناب مشتاق مصدق مومن نے ایک افسانہ "ذاتی" سنایا۔ شرکائے نشست نے نوجوان افسانہ نگار کی فنی صلاحیتوں کو سراہا اور افسانہ کو بے حد پسند کیا۔ مہمان فنکار جناب مختار الرحمن راہی نے ایک منظوم افسانہ پیش کیا۔ افسانہ میں آپ کی شعری اور افسانوی تکنیک نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ افسانہ میں ایک شاعر کا سسپنس تھا جس کی گہرائی سے طنز کے نشتر ابھرتے ہیں اور اچانک فنکاروں کی الجھی ہوئی نفسیات کے سینے میں اتر جاتے ہیں۔ افسانہ علامہ اقبال کے اس شعر کی ترجمانی کرتا ہے ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

جناب راکیش صاحب اور راہی صاحب نے کچھ غزلیں پیش کیں نیز مقامی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(محمد شفیق بیابانی، سکریٹری
انجمن ترقی اردو بھیمڑی)

لکشمیشور ضلع دھارواڑ میں

(اردو) دارالمطالعہ کا قیام

لکشمیشور کی ایک دیرینہ ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نوجوانانِ لکشمیشور نے ایک دارالمطالعہ کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ یہ دارالمطالعہ بہ یادِ حضرت شاہ ابوالحسن ادیبؒ کھولا جا رہا ہے۔ ۲۰ر نومبر کو اس کا افتتاحیہ جلسہ ہو رہا ہے جس کی صدارت جناب کے مقبول احمد شریف فرمائیں گے۔ دارالمطالعہ کا افتتاح جناب حاجی حضرت صاحب کریں گے۔

(ریاض احمد)

رضا ڈگری کالج رامپور میں یومِ میر

رامپور ۶ر نومبر۔ کل رضا ڈگری کالج میں میر ڈے منا کر خدائے سخن میر تقی میر کو ملک کے نامور ادیبوں نقادوں اور شعراء نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اعلیٰ حضرت ہز ہائی نس نواب صاحب آف رامپور جنھوں نے میر ڈے کا افتتاح کیا۔ پرنسپل ڈگری کالج ڈاکٹر او۔ بی۔ ایل کپور اور پروفیسر نجم الدین نقوی نے خیر مقدم کیا اور سب سے پہلے اعلیٰ حضرت نے خدائے سخن میر کی تصویر کی نقاب کشائی فرمائی۔ نقاب کشائی کی رسم کے بعد پرنسپل رضا ڈگری کالج ڈاکٹر او۔ بی۔ ایل کپور نے اپنے مخصوص انداز میں اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیرونی ادیبوں اور نقادوں کا حاضرین سے تعارف کرایا۔

یومِ میر میں جن مقامی اور بیرونی ادیبوں نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

(۱) خطیب العصر مولانا مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی (۲) اکبر علی خاں صاحب اسسٹنٹ لائبریرین رضا لائبریری رام پور (۳) جناب مالک رام صاحب (۴) پروفیسر احتشام حسین صاحب (۵) ڈاکٹر محمد حسن (۶) مولانا شبیر الحسن صاحب (۷) فرقت کاکوروی (۸) علامہ اختر شاں ٹہری (۹) خاور رامپوری (۱۰) ہلال رضوی (۱۱) تصور حسین زیدی (۱۲) آفتاب ٹہری۔

(روزنامہ ناظم)

اردو صحافت نے ہندوستان کی آزادی میں بڑا حصہ لیا ہے

حیدرآباد ۹ر اکتوبر۔ پرسوں شام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نارائن گوڑہ میں ینگ پیچررز نے یومِ صحافت منایا اس موقع پر اخباری نمائندوں اور لیکچررز کے درمیان دوستانہ مذاکرہ منعقد کیا گیا جناب وی بی سیتا رام رائے منیجر یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا یو این آئی اور جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے اس موقع پر تقاریر کیں۔

پروفیسر ایس اے گوبند راجن صدر شعبہ صحافت جامعہ عثمانیہ نے جو اس موقع پر موجود تھے۔ اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ایک عام احساس کے مطابق مختلف اخبارات کے اداریوں کو صرف چند لوگ ہی پڑھا کرتے ہیں۔

جناب عابد علی خاں نے اردو صحافت کے ارتقاء پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت نے ہندوستان کی آزادی میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے جس کا ایک ثبوت راجہ رام موہن رائے کا اردو میں جاری کردہ اخبار ہے جناب آنند راؤ ٹوٹا صدر ینگ لیکچررز نے صدارت کی اور جناب وی ایس گلکرنی جنرل سکریٹری نے خیر مقدم کیا۔

(الجمعیۃ)

میر تقی میر پر ایک ایکٹ کا ڈرامہ —— انعامی مقابلہ

یوپیانے اس سال میر تقی میر پر ایک ایکٹ کے ڈرامے کا انعامی مقابلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستان کے تمام ادیبوں اور فن کاروں سے گذارش ہے کہ وہ میر تقی میر کی حیات، شخصیت اور شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایکٹ کا دلچسپ ڈرامہ جو ۴۵ منٹ کا ہو اس انعامی مقابلے کے لیے ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

انعامات دو ہوں گے۔ پہلا انعام ۲۵۰ روپیہ (دو سو پچاس روپیہ) کا اور دوسرا انعام ۱۵۰ (ایک سو پچاس روپیہ) کا ہوگا۔

حامد اشا منڈی۔ یوپیا (U.P.I.A) اسٹوڈنٹس سرکل انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ ڈی۔ ان۔ روڈ بمبئی ۱

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ و پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا